⊙ ڈاکٹر مشتاق عادل
صدر شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ
⊙⊙ ڈاکٹر روبینہ شہناز
پروفیسر (ریٹائرڈ)، شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سانپ سے زیادہ سیراب اور ہمارے سماجی رویے

Abstract:

Certain politicians in Pakistan misuse the workers of political parties as a ladder in getting their power. But coming into power, they totally forget the sacrifice of the workers. On the other hand, those who seem to be involved in welfare work are busy extending business through smuggling and black marketing. The writer of the novel "SANP SEY ZAIDA SAIRAB" clearly highlights this important aspect. The writer says how certain politicians get their vested interests befooling their workers. This very novel speaks the history of 60s and 70s and also comprises the story of exploitations of workers.

Keywords:

Personal Interest, Rumours, Socialism, Organized, Saviour, Profiteer

خالد فتح محمد کا شمار عہد حاضر کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کا ناول سانپ سے زیادہ سیراب ۲۰۱۴ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ یہ ناول اردو کے موجودہ صدی میں لکھے گئے ناولوں میں موضوع کے لحاظ سے اہم ناول ہے۔ ناول کی ابتدا قیام پاکستان سے شروع ہوتی ہے اور ۱۹۷۷ء تک کے ملکی حالات کو موضوع بناتے ہوئے ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے۔ ایک طرح سے یہ ناول مذکورہ دور کی سیاسی تاریخ بھی ہے۔ ناول میں کاروباری طبقے کی سوچ، مطلب پرستی اور خود غرضی کو اجاگر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کس طرح یہ اپنے شخصی مفاد کی خاطر تمام اصول وضوابط کو بھول جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو نیک اور پارسا ثابت کرنے کے لیے یہ بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور غریبوں کی مدد کرتے ہیں مگر اس کام میں بھی، نیکی کا جذبہ، خدا کا ڈر یا انسانیت کی خدمت مقصود نہیں ہوتی بلکہ یہاں بھی

وُہ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے آگے آگے نظر آتے ہیں۔

ناول میں ایوب خاں کے دورِ اقتدار میں ملک میں انقلابیوں کی جدو جہد کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بائیں بازو کے نظریاتی کارکنوں کو ''ٹنڈے'' کہہ کر یہ بھی تاثر دیا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے نظریے اور سوچ پر ایسے ہی پختہ اور کاربند ہیں جیسے ان کا دایاں بازو ہے ہی نہیں۔ ناول نگار نے اس تلخ حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے کہ جنگ کا میدان ہو یا سیاست کا کچھ خاموش مجاہد اور کارکن قربانیاں دے کر جیت کی راہ ہموار کرتے ہیں مگر جب منزل مقصود مل جاتی ہے تو اُن قربانیاں دینے والوں کی کوئی نہیں پوچھتا، تمام مراعات سہولیات اور شہرتیں مفاد پرستوں، چاپلوسی کرنے والوں اور چڑھتے سورج کے پجاریوں کے حصے میں آتی ہیں۔ ناول میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے بھی بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس جنگ کو جیتا گیا، جنگ کے دنوں میں کس کس طرح کی افواہیں اڑتی ہیں۔ کس طرح لوگ چندے جمع کر کے کھا جاتے ہیں اور بعض چندہ دینے والوں کے چندہ دینے کے پیچھے کیا عزائم ہوتے ہیں۔

''سانپ سے زیادہ سیراب'' میں اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں ستائے لوگوں کو کس طرح سوشلزم میں اپنے مسائل کا حل نظر آیا تھا اور جب یہ کوشش کامیاب ہوگئی تو کس طرح شیخ سبحان جیسے لوگ ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے۔ ان لوگوں نے نہ صرف اپنی تجوریاں بھریں بلکہ پارٹی کے بنیادی نظریے کو بھی نقصان پہنچایا اور غریبوں کی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔

ناول میں خوب صورت پیرائے میں یہ حقیقت اجاگر کی گئی ہے کہ مغرب کے زیر اثر جب پاکستان میں کچھ لوگوں نے ابتدائی طور پر سوشلزم کا پرچار شروع کیا تو دولت مند طبقہ اس تحریک سے اتنا ہی خائف ہوا جتنی غریب لوگوں کو اس سے توقعات وابستہ ہوئیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو حقیقت ہوگی کہ سوشلزم کا پرچار کرنے والوں کی طرف آنے والوں کی نسبت اس کی مخالفت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ شیخ سبحان جیسے لوگ جن کا مقصد ہی دولت کمانا ہے وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ اُن کے نوکر اور وُہ برابر ہو جائیں ایک دن شیخ سبحان نے ناول کے مرکزی کردار حامد کو اپنے پاس بلایا جو اس کے دیرینہ ملازم کا بیٹا بھی تھا اور اس سے کہنے لگا:

> ''ذرا سوچو! انھوں نے دہرایا، 'سب فرق ختم ہوگیا۔ تمہارے اور میرے درمیان میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ہم دونوں سرکار کے ملازم ہیں۔..... ' اُن کی سانس پھول گئی تھی۔ انھوں نے چھاتی پر ہاتھ پھیرا، 'میں جو لوگوں کو روزگار مہیا کرتا ہوں، خود سرکار کا ملازم ہوگیا۔ یہ اب کفر ہے کہ نہیں!' ......انھوں نے لمبی سانس لی...... 'دیکھو لڑکے! ہم نے ملک کو بنانے میں بہت محنت کی ہے۔ اب اسے دہریوں کے حوالے کر دیا جائے؟''(۱)

خالد فتح محمد نے اس بات کی بھی عکاسی کی ہے کہ یہ دولت مند، سرمایہ دار اور کاروباری حضرات جو شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ ناجائز ذرائع سے اکٹھی کی گئی دولت میں سے اپنے مطلب اور جھوٹی شہرت کے لیے کچھ صدقہ خیرات کرتے ہیں تو بھی ان کا مقصد انسانیت کی خدمت یا احکاماتِ خداوندی پر عمل نہیں ہوتا بلکہ کچھ مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ یہ بظاہر حاجی، نمازی کا روپ دھارنے والے سرمایہ دار اندر سے کتنے ظالم ہوتے

ہیں۔ بندوں کو مروانا، غائب کروانا، بھٹیوں میں پھینک کر ختم کروا دینا اور اس واقعہ کو حادثہ قرار دے دینا ان لوگوں کے لیے معمولی بات ہوتی ہے۔ اپنے ملازمین پر رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے وہ یہ تمام طریقے استعمال کرتے ہیں۔ شیخ سبحان نے جب حامد کو اپنے بیٹے شیخ ابرار کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے اور اس کی باقاعدہ ہفتے میں دو بار رپورٹ دینے کا حکم صادر کیا تو ساتھ سختی سے اس بات کی بھی تنبیہ کی کہ یہ راز فاش نہیں ہونا چاہیے اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا:

''اور اگر ابرار کو پتا چل گیا یا تم نے اپنے کام میں غفلت کی تو تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو!'

......میں شیخ سبحان کی شہرت سے واقف تھا۔ اُن کے متعلق مشہور تھا کہ جو ملازم حکم عدولی کرتا اُسے وہ اپنی فاؤنڈری میں پھینکوا دیتے تھے۔ میں اُن کے لہجے کی شدت سے خوف زدہ ہوا اور اُس نظارے سے بھی جب مجھے بھٹی میں پھینکا جائے گا۔''(۲)

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کسی بھی نظام، حکومت یا ادارے کے خلاف اُسی وقت تحریک جنم لیتی ہے جب اکثریت کو احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ ان کی بقا اس نظام حکومت یا ادارے میں تبدیلی لائے بغیر ممکن نہیں۔ یہ حالات کے ستائے، سماج کے دھتکارے اور مایوس لوگ ذہنی طور پر اتنے بدظن اور باغی ہو چکے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی ایجنسی یا ملک انہیں اپنے ہی بھائی بندوں پر حملہ کرنے، خودکش دھماکے کرنے یا ملکی املاک کو نقصان پہنچانے کے لیے بھی کہے تو وہ تیار نظر آتے ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی سیاسی یا سماجی تنظیم حالات کی تبدیلی، انصاف کی امید اور مساویانہ سلوک کرنے کا وعدہ کرتی ہے تو ایسے ہی نوجوان اس کے لیے ہراول دستے کا کام کرتے ہیں۔ آتش بھی ایک ایسا ہی نوجوان تھا جس نے غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی اور زمانے کے تھپیڑے سہتے سہتے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ اس کی ملاقات انقلابیوں سے ہو گئی اس حوالے سے اُس نے حامد کو بتایا:

''میرا باپ کھیت مزدور ہے۔ میری ماں بھی اسی طرح کا کچھ نہ کچھ کرتی ہے۔ جب گندم پک جائے تو چوری سٹے توڑتی ہے۔ اسی طرح جب بھریاں اُٹھائی جاتی ہیں تو سٹے اٹھاتی ہے۔ دھان بھی ایسے ہی کسی نہ کسی طرح اکٹھا کرتی ہے۔ میں پرائمری سکول پاس کر گیا۔ اتفاق سے پڑھائی میں اچھا تھا، میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر نے کچھ فاصلے پر واقع قصبے کے ہائی سکول میں داخلہ لے دیا۔ میں میٹرک پاس کر گیا۔ میٹرک کے نتیجے کے انتظار کے دنوں میں کسان اور مزدور کو حقوق دلوانے والی سیاسی پارٹیوں سے میرا رابطہ ہو گیا۔ مجھے پرائمری کے دنوں سے ہی امیر لوگ برے لگنا شروع ہو گئے تھے۔''(۳)

ناول کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار نے اس حقیقت کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ اولاد والدین کے لیے بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے اور ماں باپ نے بہت ساری توقعات وابستہ کر رکھی ہوتی ہیں کہ بیٹا بڑا ہو کر ان کے لیے کس طرح معاون ثابت ہو گا مگر جب بیٹا بڑا ہو کر نئے رستے پر چل نکلتا ہے تو ان کے خوابوں کے محل چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ وہ والدین جنھوں نے غربت میں زندگی گذاری ہو۔ لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں سُنی ہوں۔ محنت مزدوری کر کے وقت گذارا ہو، جب بیٹے کو انقلابیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں تو انہیں اس بات سے قدرے تسکین ہوتی ہے کہ اب حالات

بہتر ہو جائیں گے، لوگوں کی زندگیاں پُرسکون ہو جائیں گی اور مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ حامد نے جب گاؤں میں رہنے والے آتش کے والدین سے ایک دو ملاقاتیں کی تو اُس نے جو کچھ محسوس کیا اُس کو ناول میں یوں بیان کیا گیا ہے:

> ''اس کے ماں باپ نے کھیتوں اور گھروں میں کام کرتے ہوئے، لوگوں کے احسان اٹھاتے ہوئے، ڈانٹیں برداشت کرتے ہوئے، ہر قدم پر اپنی انا سے سمجھوتا کر لیا تھا، یہاں تک کہ اُن کی انا دم توڑ گئی تھی۔ وہ بے کسی کی ایک مثال تھے۔ مجھے ان سے دو مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ دونوں کے چہروں پر موسموں کی شدت، حالات کے جبر اور مایوسی نے ایک کھردرا پن ثبت کر دیا تھا۔ اس کے باوجود آتش دونوں کی اُمید تھا۔ وہ جب ظلم اور ناانصافی کے خلاف بول رہا ہوتا تو وہ اُسے پیار، حیرت، غرور اور امید کے ساتھ دیکھ رہے ہوتے۔''(۴)

سرمایہ دار اور تاجر ہوں یا جاگیردار اور زمیندار دونوں طبقے غریب کا استحصال کرنے میں برابر کے شریک ہیں۔ دونوں گروہوں کا طریقہ کار تو مختلف ہوسکتا ہے مگر دونوں گروہوں کو اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے اس لئے غریب، مزدور، نوکر اور کسان کو زندگی گذارنے میں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آتش کا باپ غریب کسان تھا جس نے ساری عمر زمینداروں کی نوکری کی اور گاؤں میں رہا جبکہ حامد کا باپ شہر میں رہتا تھا اور اس نے اپنی تمام زندگی شیخ سبحان کی نوکری کرتے ہوئے گذاری مگر جب دونوں کی اولاد جوان ہوئی اور انہوں نے تعلیم کے ذریعے شعور اور آگاہی حاصل کر کے اس غلامی سے چھٹکارے کے لیے کوشش کی۔ انہیں جو پلیٹ فارم میسر آیا وہاں انہوں نے بھرپور کوشش کر کے اس ظالمانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی۔ ناول نگار نے بہت دلچسپ طریقے سے واضح کیا ہے کہ کس طرح اولاد اپنے والدین پر ہونے والے مظالم پر کڑھتی ہے۔ حامد بھی ایک دن اپنے اور آتش کے والدین کی زندگی کا موازنہ کرتے ہوئے سوچ رہا تھا:

> ''آتش کے باپ نے ایک جاگیردار کی غلامی کی جبکہ میرا باپ اپنی زیست کے لیے سرمایہ دار کا دست نگر رہا۔ دونوں کے آقاؤں کے درمیان میں واضح فرق ہوتے ہوئے بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں کا مقصد اپنے مفاد کا تحفظ لیکن طریقہ کار مختلف! جاگیردار اپنے غلاموں کو پیار، فراخ دلی، اپنایت اور ہمدردی سے ہانکتے ہوئے تشدد کا نشانہ بناتا ہے جب کہ سرمایہ دار ایک لاتعلقی، نفرت، بیگانگی اور تکبر کے ساتھ تنخواہ دے کر اپنی برتری جتاتے ہوئے غلام بنائے رکھتا ہے۔ دونوں کے نزدیک آتش کا باپ اور میرا باپ ایک ہی جنس ہیں۔''(۵)

''سانپ سے زیادہ سیراب'' ایسا ناول ہے جس میں ناول نگار نے غریب، مزدور، کسان اور دیگر پس ماندہ طبقوں کے حالات، اُن کا شروع شروع میں سوشلسٹوں سے خوف زدہ ہونا، پھر کچھ لوگوں کا اس تحریک میں دلچسپی لینا اور اس حوالہ سے کچھ واقعات کو بھی اجاگر کیا ہے مگر ساتھ ساتھ سوشلزم کا پرچار کرنے والوں کے نظریات اور خیالات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ناول نگار نے بتایا ہے کہ جب شیخ ابرار، حامد کے ہمراہ ایک تانگے میں سوار ہو کر آتش کے گاؤں میں کچھ لوگوں سے ملاقات کے لیے پہنچا تو وہاں آتش کے علاوہ گروپ کے تین اور رکن بھی وہاں موجود تھے۔ اس کے علاوہ گاؤں کے پانچ اور آدمی بھی چارپائیوں پر موجود تھے کہ اتنے میں ایک عمر رسیدہ شخص جس کا تعارف ''چاچا رولا''

کے نام سے کروایا گیا حقہ لے کر آ گیا اور کوچوان بھی گھوڑے کو چارا وغیرہ ڈال کر اس اکٹھ میں شامل ہو گیا تو شیخ ابرار نے بات چیت کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے بتایا کہ آج کے اکٹھ کا مقصد سرمایہ داروں ،صنعت کاروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی ناانصافیوں کے حوالے سے آ کر لوگوں کو آگاہ کرنا ہے۔شیخ ابرار کے منہ سے نکلنے والے الفاظ جہاں سوشلزم کے بنیادی فلسفے کا آسان لفظوں میں تعارف ہیں وہاں کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کی بھی عکاسی ہے۔شیخ ابرار نے اپنی گفتگو کے دوران حاضرین کو بتایا:

''شہر میں میرے باپ کی تین کپڑے کی دکانیں،ایک کھڈیوں کا اور ایک لوہے کا کارخانہ اور عالی شان دفتر ہے۔اُس کے اس سلسلے میں تقریباً سو کے قریب آدمی کام کرتے ہیں۔اُسے ان آدمیوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں،اُسے صرف اپنے سرمائے کی بقا میں دلچسپی ہے۔وہ اپنا سرمایہ دگنا،چارگنا......جتنا بھی ممکن ہو سکے بڑھانا چاہتا ہے۔اب اسے دیکھو......'اُس نے میری طرف اشارہ کیا؛'اِس کا باپ ہماری ایک دکان میں کام کرتا ہے۔وہ پچھلے چالیس برس سے دکان سنبھالے ہوئے ہے لیکن میرے باپ نے اُس کی تنخواہ میں ایک پائی کا اضافہ نہیں کیا۔جانتے ہو کیوں؟......' جانتے ہو کیوں؟' اُس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا......' کیوں کہ میرا باپ امیر آدمی ہے اور اس کا غریب۔ہر غریب آدمی کا مستقبل امیر آدمی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ہر امیر آدمی خودغرض ہوتا ہے،خودغرضی ہی اُسے امیر بناتی ہے۔میرے باپ کی نوکری چھوڑ کر اس کا باپ اپنا مستقبل خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔اگر اُسے کسی دوسری جگہ ملازمت نہ ملی تو؟ کیا وہ واپس لے لیا جائے گا؟ امیر آدمی کی کمینگی اُس کی یاداشت کا حصہ ہوتی ہے۔وہ اُسے کبھی واپس نہیں لے گا اور اگر لے گا بھی تو کم تنخواہ پر۔''(۶)

ناول میں تاجر طبقہ کی چالاکیوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے اور لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو نیک، پارسا اور محبت وطن ظاہر کرنے والوں کی اصلیت کا بھی پردہ چاک کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دنوں کے واقعات، لوگوں کے جذبات ،حکومت کے بیانات اور اصل حقائق بھی بیان کیے گئے ہیں۔خالد فتح محمد نے بتایا ہے کہ پاکستان سے محبت کا دعوے کرنے والے، دہریوں اور کافروں سے ملک بچانے کے دعوے دار شیخ سبحان نے کس طرح جنگ کے دنوں میں منافع کمانے کا منصوبہ بنایا۔اصل میں ناول نگار نے شیخ سبحان کا کردار پیش کر کے اس پورے طبقے کی اصلیت اجاگر کی ہے جنہوں نے اس ملک کو اسمگلنگ، چور بازاری اور گراں فروشی کے ذریعے نقصان پہنچایا ہے اور اپنی جائداد میں اضافہ کیا ہے۔ بینک بیلنس بڑھایا ہے اور کاروبار کو مضبوط کیا ہے۔ بدقسمتی سے یہی تاجر طبقہ اب ممبران اسمبلی کے روپ میں ملکی سیاست میں بھی خاصہ اثر انداز ہو رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت ملک کا تاجر طبقہ خوشحال اور غریب آدمی پس ماندگی کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ جب حامد نے شیخ سبحان کی بیوی سے شیخ سبحان کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بڑی سادگی سے بتایا:

''ان کا خیال ہے کہ جنگوں کے بعد قیمتیں تیزی کے ساتھ اوپر جاتی ہیں۔اس نے ایک گرہستن کی

سادگی سے کاروبار کی خاندانی منصوبہ بندی پر سے پردہ اُٹھانا شروع کر دیا۔ وہ لائل پور اور کیمبل پور جا کر کپڑا خرید کے گوداموں میں بھر رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ دونوں ملک ایک مہینے سے زیادہ لمبی جنگ نہیں لڑ سکتے'……'خالہ جان! یہ تو تھکا دینے والا کام ہے۔ وہ چھوٹے شیخ صاحب کو اپنی جگہ پر کیوں نہیں بھیجتے ؟'……'بچوں کے ابا کا خیال ہے کہ ابرار لا پرواہ ہے، خرید مہنگی کرے گا۔ وہ مل مالکان کو یہی بتاتے ہیں کہ بُرے دن آنے والے ہیں اور وہ اُن پر احسان کر رہے ہیں۔''(۷)

ناول نگار نے ہماری زندگی کی اس تلخ حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ یہاں اپنے حقوق کے لیے جدو جہد کرنے والوں کی کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور حکمران کس طرح اپنے وسائل واختیارات کو استعمال کر کے مخالفین کو انجام تک پہنچاتے ہیں۔ طاقت کے بل بوتے پر حق کی آواز کو دبانا اصل میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سوچ ہے اور یہ طبقات کبھی نہیں چاہتے کہ غریب، مزدور کسان اور دیگر پس ماندہ طبقوں کے افراد اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کریں، منظّم ہوں یا کوئی گٹھ جوڑ ہو سکے، اس لیے ملوں اور فیکٹریوں میں مالکان کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو کسی منظّم حادثے کی وجہ سے موت آجاتی ہے تو جاگیردار طبقہ کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو اندھے قتل کی صورت میں جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ حامد اور اس کے ساتھیوں کو جب جیل میں اپنے ایک ساتھی کے بارے میں اطلاع ملی کہ اُسے کسی حادثہ کے ذریعے مارنے کی پلاننگ کی جارہی ہے تو انہوں نے کسی کی وساطت سے فیض احمد فیض تک رسائی کی کوشش کی۔ حامد نے فیض سے ملاقات میں جس انداز سے اپنے ساتھی کے بارے میں بتایا اُس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حکمرانوں کے خلاف بات کرنے والوں سے کیا سلوک ہوتا ہے۔ حامد ''امروز'' کے دفتر میں پہنچا تو جو حالات پیش آئے اس حوالہ سے وہ بتاتا ہے:

''فیض صاحب نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ ہمارے ایک کارکن کو پولیس نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا ہے چند دنوں سے یہ افواہ گردش میں ہے کہ اُسے مار دیا جائے گا۔ اُس کی بیرک میں دو قاتل منتقل کر دیے گئے ہیں اور عام رائے ہے کہ اُسے جھگڑے میں الجھا کر مار دیا جائے گا۔''(۸)

پاکستان میں قانون کی عملداری صرف غریب اور کمزور لوگوں کے لیے ہے۔ انگریز کے بنائے اس انتظامی نظام میں افسر شاہی کو بہت اختیارات حاصل ہیں جو غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور دیگر پس ماندہ طبقات کے لیے مشکلات کا موجب بنتے ہیں۔ پٹواری اور تھانیدار دیہاتی لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور انہیں ڈرا دھمکا کر رقم بٹورتے ہیں تو شہروں میں ٹیکس انسپکٹر اور محکمہ ایکسائز اور بلدیہ کے اہلکار اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے چھوٹے دکانداروں، کوچوانوں، ریڑھی بانوں اور دیگر کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والوں کا استحصال کرتے ہیں۔ ناول نگار نے اس شتر بے مہار قانون کی عمدہ مثال پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران بلیک آوٹ کے دورانیہ میں اگر کوچوان ٹانگوں کے لیمپ روشن کرتے تو پولیس ان کو جرمانے کرتی تھی جب کہ دوسری جانب ٹانگوں کا انسپکٹر انہیں لیمپ روشن نہ کرنے پر جرمانے کر رہا تھا بلکہ سزا دے رہا تھا۔ اس بات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ قانون اور آئین کی حیثیت ہمارے

اہلکاروں اور افسروں کے لیے موم کی ناک کی طرح ہے جیسے چاہیں اپنے مقاصد کے لیے موڑ لیں۔ حامد جب ایک رات خواجہ ارشد کے ہمراہ تانگوں کے اڈے کے پاس سے گذرا تو اُس نے دیکھا:

> ''کسرتی جسم والا ایک آدمی چابک لہراتے ہوئے کسی کوچوان کو مار رہا تھا تو کسی کو گالیاں دے رہا تھا۔ خواجہ ارشد ہاتھ ملا کر آگے نکل گیا اور میں معاملات سمجھنے کے لیے وہاں رُک گیا۔ چابک لہرانے والا آدمی میونسپل کمیٹی میں تانگوں کا انسپکٹر تھا۔ اُس نے شراب پی رکھی تھی، اُس کے مطابق تانگوں پر بلیک آؤٹ کا قانون لاگو نہیں ہوتا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ کوچوان اپنے اپنے تانگوں کے لیمپ جلائیں۔ کوچوان پس و پیش کر رہے تھے کہ لیمپ جلانے پر پولیس چالان کر دیتی ہے اور سواریاں جاسوس سمجھ کے ٹھکائی کریں گی۔ انسپکٹر اِسے حکم عدولی سمجھتے ہوئے انھیں چابک سے مار رہا تھا۔''(۹)

ناول میں ناول نگار نے پاکستان کی سیاست کی جھلک بھی عمدہ طریقے سے پیش کی ہے۔ یہاں لوگ سیاست میں مال بنانے کے لیے آتے ہیں۔ سیاست کے چھتری کے نیچے بجلی چوری، گیس چوری اور ٹیکس چوری آسانی سے ممکن ہوتی ہے اس لیے جاگیردار اور سرمایہ دار دونوں طبقے ہی اپنے لیے اقتدار میں شمولیت لازمی سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں سیاسی جماعتیں بدلنے والے لیڈروں کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے سیاست دان چڑھتے سورج کے پجاری ہیں اور ضمیر کا فیصلہ ہوا کا رخ دیکھ کر کرتے ہیں۔ سیاست مکمل طور پر کاروبار بن چکا ہے۔ سیاست کو عبادت کا نام دینے والے سیاست میں رہتے ہوئے ہی قرضے معاف کرواتے ہیں، سرکاری زمین الاٹ کرواتے ہیں اور سرکاری ٹھیکے لیتے ہیں۔ ان مراعات و سہولیات کو دیکھ کر ہر کاروباری شخص کو جہاں اپنے کاروبار بڑھانے کی فکر ہوتی ہے وہاں اس کی خواہش ہوتی کہ اُسے سیاست کی چھتری میسر آجائے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا کر عام آدمی کے حقوق کی بات کی تو عوام نے بڑی تعداد میں اُسے نجات دہندہ سمجھ کر اُس کا ساتھ دیا مگر ساتھ ہی موقع پرست اور مفاد پرست لوگ بھی اس کی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ان لوگوں میں ایک نام شیخ ابرار کا بھی تھا جو بظاہر غریبوں کا ہمدرد تھا مگر اس کی اصل شکل اس گفت گو میں دیکھی جا سکتی ہے جو اُس کی ماں نے حامد سے کی۔ شیخ ابرار کی والدہ نے کہا:

> ''ابرار بضد ہے کہ سیاست میں آئے بغیر وہ کاروبار کو پھیلا نہیں سکتا۔ اُس کا کہنا ہے کہ جس طرح اِن دنوں وہ اپنے کاروبار کو چلا رہے ہیں دوسرے کئی لوگ بھی اُسی طرح اپنے اپنے کاروباروں کو چلا رہے ہیں۔ سیاست میں آئے بغیر اُن لوگوں کو مات نہیں دی جا سکتی'.....' وہ رُکی اُس نے باہر کے دروازے کی طرف دیکھا اور ایک نظر تمام دیواروں پر دوڑائی۔ مجھے یہ اطلاعات دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی لگیں۔ مجھے ایک اہم خاندان کی نفسیات سمجھ میں آ رہی تھی۔''(۱۰)

''سانپ سے زیادہ سیراب'' میں اس حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو دولت جمع کرنے کی حرص ہے وُہ اس کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ دولت مند، سرمایہ دار اور تاجر شاید ضمیر نام کی کسی چیز

سے واقف نہیں ہوتے اور اپنے مفاد کی خاطر دین، ایمان اور نظریات سب کچھ تبدیل کر لیتے ہیں۔ ناول نگار نے ایسا ہی ایک کردار شیخ سبحان کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جو شروع میں پاکستان بننے میں پیش آنے والی مشکلوں کا حصہ دار بننے اور تکالیف برداشت کرنے کے دعوے کرتا تھا حالانکہ ملک بننے میں اُسے ایک پائی کا نقصان نہ اٹھانا پڑا تھا۔ وُہ رات کو مشترکہ ہندوستان میں سویا اور صبح پاکستان میں بے دار ہوا۔ شیخ سبحان اپنے آپ کو بہت بڑا محبّ وطن بنا کر پیش کرتا تھا۔ یہاں تک کہ نوائے وقت کے علاوہ کوئی دوسرا اخبار بھی پڑھنا وُہ ملک دشمنی سمجھتا تھا مگر جب حالات رخ بدلتے نظر آئے۔ بھٹو کے نعرے ''روٹی کپڑا اور مکان'' نے لوگوں کو اپنے سحر میں لے لیا تو شیخ سبحان نے جو در پردہ اپنے بیٹے شیخ ابرار کی سرپرستی کر کے پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل کروا چکا تھا خود بھی بائیں بازو کے نظریات کا پرچار کرنے لگا۔ یہ سن کر حامد کے باپ کو جو اس کا دیرینہ ملازم تھا اتنا دکھ ہوا کہ وُہ نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا۔ ناول نگار نے ایسے لوگوں کے کردار کا پردہ یوں چاک کیا ہے:

> ''وہ کہتا ہے کہ گاہکوں کو بھی بائیں بازو کی ترغیب دو۔ آدمی کے چہرے پر وحشت بکھری ہوئی تھی۔ نوجوان کو لگا کہ آدمی کسی بھی وقت دیوار کو مکے مارنا شروع کر دے گا۔ یہ اُس آدمی کا حکم ہے جو اب تک تمام مذہبی سیاسی جماعتوں کو خدا کے خوف سے چندے دیتا آیا ہے۔ یا وہ منافقت تھی یا یہ منافقت یا دونوں عمل ہی منافقت ہیں۔''(۱۱)

دولت ایسی چیز ہے جو انسان میں غرور اور تکبر پیدا کر دیتی ہے اور یہی غرور تکبر ہے جس سے نالاں لوگ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ سرمایہ دار ہر بات کو ہر عمل کو اور ہر خدمت و قربانی کو دولت کے ترازو میں تولتے ہیں یہ کسی کی خدمات کے صلے میں کچھ دیں تو احسان کر کے دیتے ہیں اور اگر کوئی ان کا احترام یا خدمت کرے تو یہ طبقہ اس بات کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ حامد کا والد بچپن سے شیخ سبحان کا ملازم چلا آ رہا تھا۔ اُس نے اپنی جوانی اور بڑھاپا بھی شیخ کی دکان پر کام کرتے گذار دیا۔ وہ ایسا شخص تھا کہ نہ تو کبھی زبان سے شیخ سبحان کے خلاف بات نکالی اور نہ سننا گوارہ کی۔ گھر میں اگر اس کی بیوی یا بیٹے کے منہ سے شیخوں کے خلاف ایک لفظ بھی نکلتا تو اُسے ناگوار گزرتا۔ ساری عمر انتہائی محنت اور ایمانداری سے نوکری کرنے والا یہ شخص جب فوت ہوا تو شیخ جنازے میں شریک نہ ہوئے۔ شام کو سبحان ان کے گھر آیا اور جس انداز میں اُس نے گفت گو کی اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار لوگوں کے دل میں کسی کی قدر نہیں ہوتی۔ شیخ سبحان کا کہنا تھا:

> ''سکینہ بیگم! بہت افسوس ہوا' انھوں نے اپنی آواز میں گھمبیر تالاتے ہوئے کہا۔ ماں نے ہونٹوں میں کچھ بُڑبُڑایا، میں آواز نہیں سن سکا۔ شیخ سبحان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر روپوں کی گڈی نکال کر ماں کی طرف بڑھائی۔۔۔۔ 'یہ رکھ لو' اُن کی آواز میں ہمدردی کی نرمی کی بجائے برتری کا غرور تھا۔۔۔۔ 'بھائی جی! نسل در نسل آپ ہی کا کھایا ہے۔ ہمارے پاس تھوڑا بہت جو ہے آپ ہی کا دیا ہے۔ ضرورت پڑی تو آپ ہی سے لیں گے' ماں کی آواز میں جنگ کا طبل تھا۔ شیخ سبحان نے اُس طرف دیکھا اور بغیر کسی تاثر کے نوٹ جیب میں رکھ لیے۔''(۱۲)

ناول نگار نے معاشرے کے اس دردناک پہلو کی بھی عکاسی کی ہے کہ کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے قربانیاں تو کارکن دیتے ہیں مگر ان قربانیوں کا سہرا ہمیشہ لیڈروں کے سر سجتا ہے۔ اگر جاگیردار مزارع یا کاشت کار کا استحصال کرتا ہے تو سرمایہ دار مزدور کا خون نچوڑتا ہے۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے جبر کے خلاف تو صدائے احتجاج بلند ہوتی آئی ہے مگر کارکنوں کے استحصال پر شاید کسی نے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ قربانیاں دینے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی اور راہنما تھوڑے ہوتے ہیں۔ تھوڑی تعداد میں سے چناؤ آسان ہوتا ہے اس لیے راہنماؤں کی درجہ بندی اور کارنامے آسانی سے سامنے آجاتے ہیں۔ ناول نگار نے بتایا ہے کہ بیگم نصرت بھٹو کے جلسے کو ناکام بنانے کے لیے حکومت وقت نے ہر حربہ آزمایا۔ جلسہ گاہ میں پانی چھوڑا، لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس کے گولے برسائے۔ جوشیلے کارکنوں نے وہی گولے پکڑ کر واپس پولیس والوں پر پھینکے۔ آتش بھی اس کام میں پیش پیش تھا مگر بدقسمتی سے ایک گولہ واپس پھینکنے میں چند لمحات کی تاخیر ہوگئی جس وجہ سے گولہ اُس کے ہاتھوں میں ہی پھٹ گیا۔ جس وجہ سے اُسے آنکھوں سے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ حامد جب اُسے اس حالت میں اپنے گھر لایا تو اُس کی صورتحال دیکھ کر خاصہ پریشان تھا:

> ''ہم نے چائے پی۔ آتش اپنے آپ پر قابو پا جانے کے باوجود تکلیف میں تھا۔ اُس کا پیالے کو ٹٹول کر اُٹھانا میرے لیے ایک اذیت تھا۔ پیالا اُٹھانے کے لیے ہر بار جب وہ سٹول کو ٹٹولتا تو مجھے لگتا کہ ایک ٹھنڈی تلوار میرے آر پار ہوگئی ہے۔ میری نظر کے سامنے اُس کا جی ٹی روڈ کا جوش وخروش گھوم گیا۔ کیا وہ اندھا ہوگیا ہے؟ کیا اُس کی بینائی واپس آسکتی ہے؟ اگر اُس کے علاج کی ضرورت پڑی تو کون کروائے گا؟''(۱۳)

بلاشبہ کارکنوں کی قربانیاں ہمیشہ رنگ لاتی ہیں اور تحریکیں سیاسی ہوں یا سماجی و اصلاحی مخلصانہ کوششوں سے ضرور نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ پاکستان قائم ہونے سے اب تک کتنے کارکن ایسے ہیں جنھوں نے اپنی جماعتوں کے لیے کام کرتے ہوئے جانوں کی قربانی دی۔ وُہ جماعتیں اقتدار میں بھی آئیں مگر کامیابی کے بعد کسی لیڈر نے یہ نہ پوچھا کہ اُس کارکن کے گھریلو حالات کیسے ہیں۔ بہت سارے لوگ سیاسی جلسوں میں حادثات کا شکار ہو کر عمر بھر کے لیے معزور ہو جاتے ہیں مگر ان کی قربانیوں کو بھلا دیا جاتا ہے۔ ہمارے لیڈر پوائنٹ سکورنگ کے چکر میں چند دن تو اُن معزوروں اور مرنے والوں کی کاوشوں کو سراہتے ہیں، سلام پیش کرتے ہیں مگر پھر بھول جاتے ہیں۔ مرنے والوں کے لواحقین کی خبر کوئی نہیں لیتا اور معزور ہونے والوں کی کسی کو فکر نہیں ہوتی۔ یہ قربانیاں اقتدار کے لیے زینے کا کام دیتی ہیں مگر یہ زینہ مہیا کرنے والوں کی باقی زندگی مشکل میں گذرتی ہے۔ غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والا آتش جو راتوں رات انقلاب کا خواہاں تھا اور جس نے اس انقلاب سے بہت ساری امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں اپنی آنکھوں کی قربانی دے کر عمر بھر کے لیے اندھا ہوگیا۔ جب حامد اُسے اُس کے گاؤں جانے والی بس میں بٹھا کر واپس آ رہا تھا تو خیالوں میں مگن تھا کہ مقصد اور نظریے کے حصول کے لیے سب سے بڑی قربانی تو آتش کی ہی تھی مگر کسی کو اس کی قربانی کی اہمیت معلوم نہ تھی۔ حامد سوچ رہا تھا:

''میں نے جنگوں میں گمنام سپاہیوں کی بہادری کے کئی قصے پڑھے تھے۔ دراصل اُن گمنام سپاہیوں نے ہی جنگوں کے پاسے پلٹے تھے اور دیکھا جائے تو اُنھوں نے وہی کیا جو انھوں نے کرنا تھا۔ آتش بھی ایک گمنام سپاہی تھا، اُس کے جوشیلے نعروں نے مجمع کو ایسی طاقت دی کہ وہ ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے لگے ہوئے پولیس کے مورچے کو جگہ بدلنے پر مجبور کر گیا اور جگہ بدلنا ہی اُس جلوس کی کامیابی تھی جس کا تمام تر سہرا شیخ ابرار کے سر بندھا اور آتش ایک گمنام سپاہی رہا۔''(۱۴)

خالد فتح محمد کی ناول نگاری کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا کیوں کہ ان کے ناول فنی اور فکری دونوں حوالوں سے اردو ادب میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ان کے کردار معاشرے کے رویوں کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ان کے ناول "سانپ سے زیادہ سیراب" کے حوالے سے ڈاکٹر عطاالرحمٰن میو رقم طراز ہیں:

''ان کے ناول سانپ سے زیادہ سیراب کے نمایاں کردار طاہرہ، نور محمد، آتش، محمود احمد اور حکیم صاحب ہیں۔اس کا بنیادی کردار شیخ سبحان ہے جو اپنی دولت کے بل بوتے پر سیاست میں داخل ہو کر اقتدار کے تخت پر بیٹھنے کا خواہش مند ہے، جب کہ نور محمد آتش 'دلا بھٹی' بن کر سامراج کا قلع قمع کرنا چاہتے ہے۔''(۱۵)

خالد فتح محمد کے ناولوں کے کردار جیتے جاگتے انسان ہیں اور ناول نگار نے ہمیشہ حق کی فتح کو اپنے ناولوں میں دِکھایا ہے۔ان کے ناولوں کی کہانی دلچسپ اور اسلوب سادہ ہے۔ڈاکٹر طاہرہ سرور، خالد فتح محمد کی ناول نگاری کے متعلق لکھتی ہیں:

''خالد فتح محمد نے اپنے ناولوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ان کا مشاہدہ وسیع اور تجزیہ ہمہ گیر ہے۔اسلوب کے حوالے سے بھی خالد فتح محمد کے ناول انفرادیت کے حامل ہیں۔وہ بڑے سادہ انداز میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور واقعات کو آپس میں مربوط رکھتے ہیں۔''(۱۶)

خالد فتح محمد کے ناولوں کا پلاٹ عمدہ اور چست ہے۔اس کی کہانی قاری پر ایک سحر طاری کر دیتی ہے۔اور جب تک ناول ختم نہ ہو جائے اس کی دلچسپی اور حیرت ختم نہیں ہوتی۔واقعات کو سلیقے سے اور مربوط انداز میں بیان کرنے کے فن سے آشنا خالد فتح محمد کے ناول اس بات کے بھی عکاس ہیں کہ ناول نگار کا مطالعہ بہت گہرا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول فنی محاسن کے عمدہ معیار پر فائز ہیں۔ماہ جبیں اختر کے نزدیک:

''خالد فتح محمد کے ناول حقیقی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کی تحریروں میں ہمیں معاشرہ جیتا جاگتا اور سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ان کے ناول معاشی، معاشرتی، سماجی، سیاسی، اقتصادی، عسکری اور ادبیانہ فکر کے عکاس ہیں۔''(۱۷)

خالد فتح محمد نے ''سانپ سے زیادہ سیراب'' میں ہمارے معاشرے اور سیاسی کلچر کی بہت عمدہ عکاسی کی ہے۔یہ ناول جہاں پاکستانی سیاست کے ایک اہم دور سے قاری کو روشناس کرواتا ہے وہاں سرمایہ دار طبقہ کی چالوں کا بھی پردہ چاک کرتا ہے۔ناول نگار نے شیخ سبحان کے کردار کے ذریعے نام نہاد اسلام پرستوں کے اصلی چہرے ظاہر کیے ہیں تو شیخ

ابرار کے کردار کے ذریعے ہمارے سیاست دانوں کی سوچ کی عکاسی کی ہے۔ ناول پاکستان میں سوشلزم کی تحریک، ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اور آمرانہ دور حکومت کی بھی بہترین تصویر پیش کرتا ہے۔ جہاں اس ناول کے تمام کردار اپنی اپنی جگہ پر جاندار ہیں وہاں موضوع کے لحاظ سے بھی اسے پاکستانی اردو ناولوں میں اہم مقام حاصل ہے کیونکہ اس میں غریب اور پس ماندہ طبقہ کی انقلاب سے وابستہ امیدوں سے لے کر مفاد پرستوں اور موقع شناسوں کے رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مستقبل کا نقاد اس ناول پر مزید بہت کچھ لکھے گا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کہ یہ اک منفرد ناول ہے جو مصنف کی بہترین کاوش ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خالد فتح محمد، سانپ سے زیادہ سیراب،(لاہور: سانجھ پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص۱۰

۲۔ ایضاً،ص۱۲

۳۔ ایضاً،ص۲۱

۴۔ ایضاً،ص۲۲

۵۔ ایضاً،ص۲۳

۶۔ ایضاً،ص۳۶

۷۔ ایضاً،ص۱۱۲

۸۔ ایضاً،ص۱۲۰

۹۔ ایضاً،ص۱۳۴

۱۰۔ ایضاً،ص۱۶۳

۱۱۔ ایضاً،ص۱۹۰

۱۲۔ ایضاً،ص۱۹۹

۱۳۔ ایضاً،ص۲۰۴

۱۴۔ ایضاً،ص۲۰۸

۱۵۔ عطاالرحمٰن میو، خالد فتح محمد کی ناول نگاری، مشمولہ: نور تحقیق، (لاہور: گیریژن یونیورسٹی)، جلد نمبر۳، شمارہ نمبر۱۱، ص۲۳۹

۱۶۔ طاہرہ سرور، عساکر پاکستان کی ادبی خدمات اردو نثر میں، (لاہور: اکادمیات، ۲۰۱۳ء)، ص۱۴۷

۱۷۔ ماہ جبیں اختر، خالد فتح محمد کی ناول نگاری، (لاہور: لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء)، تحقیقی مقالہ، ص۱۹